© rasailojaraid.com

مولانا محمد جعفر پھلواروی

علامہ تمنّا عمادیؒ

۲۷ نومبر ۷۲ء کو علامہ محی الدین تمنّا عمادی پھلواروی اس دار فانی کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ط رحمۃ اللہ ورضی عنہ۔ ان کی عمر تقریباً ۸۸ سال تھی۔ ان کی وفات پر ہمیں تعجب نہیں۔ البتہ ان کی زندگی پر تعجب تھا کہ یہ اب تک زندہ کس طرح ہیں۔ مہینوں سے حلق کے سرطان میں مبتلا تھے۔ کوئی چیز اندر فرو نہیں کر سکتے تھے۔ صبح شام بمشکل آدھی پیالی یخنی اور چوتھائی پیالی چائے اتار لیتے تھے۔ اس بڑھاپے میں اس مختصر سی غذا کے ساتھ وہ صرف زندہ ہی نہیں رہے بلکہ آخر وقت تک ساری رات کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔ تہجد کے بڑے پابند تھے اور صبح کی نماز پڑھ کر چار پانچ گھنٹے سوتے تھے۔ جاگنے کے بعد پھر دوسرے دن صبح تک یا ملنے والوں سے علمی مذاکرہ میں مصروف رہتے تھے یا کچھ لکھتے رہتے تھے۔ بصارت اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ اپنا لکھا ہوا خود نہ پڑھ سکتے تھے۔ سماعت بھی گویا بالکل ختم تھی۔ گفتگو کا ذریعہ ایک پلاسٹک یا ربڑ کی نلکی تھی جس کی ایک طرف قیف لگی ہوئی تھی اور دوسری طرف حقے کی منہ نال۔ منہ نال کو یہ کان سے لگا لیتے اور بولنے والا قیف کے پاس اپنا منہ رکھ کر بات کرتا۔

مرحوم کی زندگی کے اتنے زیادہ پہلو ہیں کہ ایک صحبت میں کسی ایک پر بھی سیر حاصل گفتگو نہیں ہو سکتی۔ جناب اقبال عظیم صاحب نے اپنی کتاب "بنگال میں اردو" میں ایک مفصل مضمون علامہ مرحوم پر لکھا ہے لیکن مرحوم کی زندگی کے بہت سے گوشے پھر بھی تشنہ رہ گئے ہیں۔

علامہ تمنا رحمہ اللہ نے علم اور درویشی کے گہوارے میں آنکھیں کھولی تھیں اور اسی پر پروان چڑھے لیکن علم اور ذاتی کاوش و تحقیق نے ان کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ تفسیر۔ حدیث۔ فقہ، فلسفہ، منطق، تصوّف اور ریاضت کی منزلیں طے کرنے والے تو بہت لوگ اور بھی ملیں گے لیکن علامہ موصوف کو کورانہ تقلید سے سخت نفرت تھی۔ فطرت میں جذبۂ تحقیق کا مادہ قدرت نے بھرپور وسعت کے ساتھ ودیعت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کردیا تھا اس لیے جو کچھ کہتے تھے علیٰ وجہ البصیرت کہتے تھے اور اس دور میں فنِ رجال کے وہ منفرد امام تھے۔ ان کے تصورات سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن یہ تسلیم کیے بغیر چارہ کار نہیں کہ وہ کوئی بات قوی دلائل کے بغیر نہیں کرتے تھے۔

وہ پھلواری شریف سے ہجرت کرکے ڈھاکہ چلے آئے تھے۔ پھر وہاں سے چاٹگام چلے گئے۔ چاٹگام سے کراچی اپنی آنکھ بنوانے کے لیے آئے اور کراچی کی زمین نے ان کو ہمیشہ کے لیے اپنی آغوش میں رکھ لیا۔ وہ اپنا پورا کتب خانہ لے کر مشرقی پاکستان گئے اور کراچی کی دو سالہ اقامت کے دوران شاید وہ سارا نادر ذخیرہ ضائع ہو چکا ہوگا۔

شعر و سخن

مرحوم اردو، فارسی اور عربی زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ ان کی قادر الکلامی کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ایک شخص نے ان کے دو شعروں کے جواب میں دس شعر شائع کر دیے۔ بس علامہ تمنا اس کا جواب لکھنے کے لیے بیٹھ گئے۔ جانتے ہیں جواب میں کتنے شعر علامہ نے لکھے؟ صرف آٹھ ہزار۔ اسی زمین پر، اسی بحر میں اور اسی ردیف میں۔ یہ مجموعہ الفصید تا الزھراء کے نام سے شائع ہو چکا ہے اور میرے پاس موجود ہے۔

یہی حال موصوف کا فارسی میں بھی تھا اور اسی طرح عربی میں نظم و نثر یکساں لکھنے پر قادر تھے علم عروض و قوافی میں بھی وہ امام فن تھے۔ ان کا ایک قلمی رسالہ "ردیف" پر بھی ہے اور شاید ردیف پر کسی اور نے نہیں لکھا ہے۔ شوق سندیلوی کی "اصلاحِ سخن" پر مولانا تمنا نے "ایضاحِ سخن" لکھی جو شائع ہو چکی ہے۔ اس میں شعرا کی اصلاحات پر اپنا محاکمہ لکھا ہے۔

علامہ موصوف کو سخت زمین پر چلنے میں شاید بڑی سہولت محسوس ہوتی تھی۔ دو ایک شعر سن لیجیے:

قدرِ لعل ست فقط از بے رنگ اندر کوہ — ورنہ سنگے کہ بود بمقدار منگ اندر کوہ
جائے از سیلِ سرا شکم چو نماندہ بہ جہاں — رجعت قہقری افتادہ بہ گنگ اندر کوہ

اس پتھریلی زمین پر مولانا تمنا کی پوری لمبی غزل موجود ہے۔ اردو کلام میں سخت سے سخت زمین پر بے دھڑک لکھنا ان کے لیے بہت آسان تھا۔ نظم اور غزل دونوں پر یکساں عبور تھا۔ رباعیات، قطعات اور قطعہ تاریخ لکھنے میں بھی کمال حاصل تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنے ایک فضول خرچ عزیز کو نصیحت کے یہ دو شعر لکھ بھیجے :

ہم ڈر رہے ہیں دیکھ کے تیرا یہ رنگ ڈھنگ — ہو ٹھیکرا نہ ہاتھ میں جام و سبو کے بعد

قرآن کو تو کھول کے دیکھ لے فضول خرچ
لا تسرفوا لکھا ہے کلوا واشربوا کے بعد

طبیعت میں مزاح و طیبت کا عنصر بھی خاصا موجود تھا۔ پھلواری شریف میں ان کی لڑکی کی شادی تھی۔ بارانی کھانے میں وہاں فیرنی ضروری دی جاتی ہے۔ اس کے لیے انھوں نے شکر (چینی) کی درخواست دی جو نامنظور ہو گئی۔ اس لیے کہ دوسری جنگ عظیم جاری تھی اور شکر پر سخت کنٹرول تھا۔ مولانا نے دوبارہ پھر درخواست لکھی اور آخر میں یہ شعر لکھ دیا :

اب دیکھتے نہیں وہ کبھی خواب میں شکر — آتی تھی رات دن جنھیں پیشاب میں شکر

کنٹرولر کوئی شاعر تھا۔ درخواست پڑھ کر فوراً ایک من چینی کی منظوری دے دی۔

جناب سلیم اللہ فہمی صاحب نے ڈھاکے کے ایک طرحی مشاعرے کا ذکر کیا جس کا قافیہ و ردیف تھا میخانے کی خاک، پروانے کی خاک۔ مولانا تمنا نے اپنی غزل میں ایک ماڈرن نظافت پسند محبوب کا ذکر یوں فرمایا :

دُور ہی سے ڈال کر مٹی ہماری قبر میں
بُرش سے پھر صاف کر لی اپنے دستانے کی خاک

اتفاق دیکھیے کہ مشاعرے کے کسی شاعر نے "دستانے کی خاک" نہیں باندھا تھا۔

اُن کے اندر اسلام کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ جن رسموں کو وہ اسلامی روح کے منافی سمجھتے ان کے اظہار میں کسی بڑی سے بڑی شخصیت کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ان کی ایک بہت پرانی نظم مجھے اب تک یاد ہے جس کا عنوان ہے "اسلام اب کہاں رہتا ہے"۔ اس نظم کے آخری دو شعر موجودہ رجحانات سے خاصا قرب اور مناسبت رکھتے ہیں۔ ملاحظہ ہو :

اسلام اب کہاں رہتا ہے ؟

اک دن سنسان جنگل میں ہوا میرا گزر — آہ اک ٹوٹی سی مسجد دُور سے آئی نظر

اک کشش پیدا ہوئی ایسی کہ میں بے ساختہ — اس کی جانب کھنچ چلا دل باختہ جاں باختہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جا کے دروازے کے اندر جب رکھا میں نے قدم — صحن میں گھاس کو پایا قدِ آدم سے کم
جم گئی تھیں کائیاں کچھ کی ہوئی دیواروں پر — سبز مخمل کا غلاف اک تھا چڑھا میناروں پر
طائروں کے گھونسلے تھے جا بجا محراب میں — جا گنے تھے جن میں کچھ بچے تو کچھ تھے خواب میں
ایک گوشے میں تھا اک پختہ کنواں بدتر ز خام — غسل خانہ ایک کونے میں قریب الانہدام
مجھ کو اک حیرت ہوئی یہ ہُو کا عالم دیکھ کر — گھر کو مالک کے غم و یاس مجسم دیکھ کر
صحن میں آ کر میں سوئے آسماں تکنے لگا — جوشِ غمناکی میں آ کر اس طرح بکنے لگا
"پہلے جو کچھ شک و شبہ تھا وہ زائل ہو گیا — آج تیری بے نیازی کا میں قائل ہو گیا
کالعدم اسلام اور مفقود ایماں ہو تو ہو — اپنے گھر کی بھی نہیں پرواہ ویران ہو تو ہو"
میں اسی خفگی میں تھا گویا کہ اک خوش رو جواں — ایک کونے سے اسی مسجد کے نکلا ناگہاں
صحنِ مسجد رو کشِ عرشِ معلّٰی ہو گیا — محوِ حیرت تھا جو میں محوِ تجلّٰی ہو گیا
ہو ابھی محشر بپا انداز یہ رفتار کا — آرزوئیں جی اٹھیں اعجاز یہ گفتار کا
ساعدِ سیمیں مصفّٰا صورتِ شاخِ بلور — سینہ صافی مثال سطحِ دریائے نور
عرض کی میں نے کہ: اے سرمایۂ حسن و جمال — سچ بتا مجھ کو کہ ہے تو کس چمن کا نونہال
حور ہے تو یا فرشتہ یا پری زادوں میں ہے — یا ہمیں انسان جیسے خانہ بربادوں میں ہے؟
کھینچ کر اک آہ اس نے تھام کر ہاتھوں سے دل — کیا کہوں کیوں کر سنایا یہ جوابِ جانگسل
میں فرشتہ ہوں نہ جن و انس - اک ناکام ہوں — میں زمانے کا ستایا "مذہبِ اسلام" ہوں

اب جگہ ملتی نہیں لوگوں کے دولت خانوں میں
اس لیے رہتا ہوں میں چھپ کر انہی ویرانوں میں

مولاناؒ کے کلام کے یہ چند نمونے ہیں ورنہ ان کے اشعار کی تعداد بقولِ خود ان کے ۲ لاکھ کے لگ بھگ ہے - ان کے کلام اور فنی کمال کا اعتراف کرنے والوں میں حضرت جگر مراد آبادی، حضرت جوش ملیح آبادی، حضرت بابائے اردو مولوی عبدالحق - حضرت مولانا عرشی امرتسری، حضرت فضلی - حضرت نیاز فتحپوری، اور بے شمار اساتذۂ فن ہیں -

ہاؤسنگ یونین ایریا (کراچی) کے ڈائرکٹر اور بانی سید علی اکبر مرحوم کی تدفین میں مولاناؒ شریک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھے اور دورانِ تدفین قطعۂ تاریخِ وفات کہہ کر مجھے سنایا جو یہ تھا:

علی اکبر کی جواں مرگی پہ مہ — بہہ گیا آنکھوں سے دل بن کے لہو

سالِ تاریخ جو پوچھا ہم نے — بولا ہاتف غفر اللہ لہ
۱۳۸۱ھ

یہ علامۂ مرحوم کی ہمہ جہت زندگی کا صرف ایک پہلو ہے - ادبی پہلو - ان کا اصل علمی و دینی ذوق شاعری سے بالکل الگ ہے - شاعری سے تو وہ گویا عرصۂ دراز سے دستبردار ہو گئے تھے - اگر اشعار لکھتے بھی تھے تو کسی دینی و تاریخی مسئلے پر لمبی لمبی نظمیں، قصیدے لکھتے تھے اور عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں لکھتے تھے - گل و بلبل والی شاعری برائے نام رہ گئی تھی -

تدبرِ قرآن

علامہ تمنا اگرچہ شعر و سخن اور فنِ عروض و قوافی میں ید طولیٰ رکھتے تھے لیکن ان کا اصل ذوق تدبرِ قرآن تھا - ابتدا میں حضرت موصوف ایک صوفی اور مقتدر عالم تھے - طریقت کے وظائف و اوراد چلّے اور ریاضتیں خوب کرتے رہے - لیکن تدبرِ قرآن نے انھیں ہر چیز سے بے نیاز کر دیا - وہ خود مولانا شاہ رشید الحق رحمۃ (سجادہ نشین خانقاہ عمادیہ منگل تالاب پٹنہ سٹی) کے مرید و خلیفہ تھے لیکن بدعات سے ان کا تنفر اتنا بڑھتا گیا کہ پورے نظامِ تصوف سے بیزار ہو گئے اور اپنے دور کے صوفیوں کے ظاہری امتیاز، تصنع، دنیا پرستی، قبر پرستی اور رسم پرستی اور تغافل عن القرآن کو دیکھ کر پورے طبقۂ صوفیہ سے لاتعلقی کا اظہار کر دیا - فرماتے تھے کہ: ان تمام خانقاہوں میں مکتوبات، ملفوظات، مکشوفات، مثنوی، دیوانِ حافظ وغیرہ کے درس تو دیے جاتے ہیں لیکن قرآن کا درس صرف اس لیے نہیں دیتے کہ اگر حلقۂ مریدین میں وہ حریتِ ضمیر پیدا ہو گئی جو قرآن پیدا کرنا چاہتا ہے تو مریدین ان مسندوں کے ذہنی غلام نہیں رہیں گے" مجھ سے شکایت کی کہ تمہارے گھر پر برسوں درسِ قرآن ہوتا رہا اور اب تم لوگوں نے بھی اسے ترک کر دیا ہے - آخر انھوں نے خود قرآن کا درس شروع کر دیا -

درسِ قرآن کے دوران یہ بار بار محسوس ہوا کہ قرآن ایک بات کہتا ہے اور ہماری تاریخ و روایات اس کے بالکل خلاف بات کہتی ہیں - اس احساس نے انھیں از سرِ نو تاریخ اور روایاتِ حدیث کے

© rasailojaraid:com

© rasailojaraid.com

غائر مطالعے پر مجبور کیا۔ اب ان کا مطالعہ محض سمجھنے تک محدود نہ تھا بلکہ ناقدانہ اندازِ فکر پیدا ہوگیا تھا۔ وہ صرف روایات کو نہ دیکھتے بلکہ ہر سند کے راویوں کو پرکھنے لگے۔ اور اس سلسلے میں انھیں کتبِ رجال کا بڑا غائر مطالعہ کرنا پڑا اور فی الواقع وہ اس فن کے امام ہوگئے۔ کتبِ رجال کی چھان بین کے بعد بہت سے نئے حقائق ان پر روشن ہوگئے اور اب ان کی تنقیدِ روایات نے ایک نیا رخ اختیار کرلیا۔ اب وہ فقط یہ نہیں کہتے تھے کہ فلاں روایت قرآنی سپرٹ یا عقل یا مشاہدے یا عام مسلمات کے خلاف ہے بلکہ یہ بھی کہتے کہ کتبِ رجال نے فلاں فلاں راویوں کو (جو اس روایت کی سند میں ہیں) ساقط الاعتبار قرار دیا ہے۔ اس لیے ہر روایت اصول درایت اور اصول روایت کی کسوٹی پر کس کر ردّ و قبول کا فیصلہ کرنا چاہیے۔

چنانچہ موصوف نے بہت سی ایسی روایتوں کو ہدفِ تنقید بنایا جو اب تک صحیح اور واجب التسلیم سمجھی جاتی رہی ہیں۔ وہ فرماتے تھے اور اپنی تحریروں میں لکھا بھی ہے کہ سنت کا اتباع فرض ہے لیکن ہر حدیث کو سنت سمجھنا سراسر غلط ہے۔ بعض آحاد کو وہ بالکل صحیح بتاتے اور کہتے کہ لوگوں نے کسی گروہی یا ذاتی مفاد کی وجہ سے ضعیف قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہ قرآنی روح کے عین مطابق ہے۔ مرحوم کے ان نظریات کی مثالیں بے شمار ہیں لیکن ان کے ذکر اور تشریح کی یہاں گنجائش نہیں۔

قرآن پاک کے تفسیری نکتے وہ ایسے ایسے بیان کرتے تھے جو اس سے پہلے کسی نے نہیں لکھے۔ ان کی چند مثالیں سن لینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

ا۔ یہ جو قرآن (الانعام: رکوع ۹) کا ترجمہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے ستارے، چاند اور سورج کو دیکھ دیکھ کر ہر ایک کو کہا کہ یہ میرا رب ہے۔ پھر جب وہ ایک ایک کرکے ڈوب گیا تو فرمایا کہ میں ڈوبنے والے کو پسند نہیں کرتا۔" تو یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ دراصل واقعہ یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ: واذ قال ابراھیم لابیہ اٰزر (جب ابراہیمؑ نے اپنے باپ آزر سے کہا ......) آگے انہی دونوں کا مکالمہ ہے۔ ستارے کو دیکھ کر ابراہیمؑ نے نہیں بلکہ آزر نے کہا کہ یہ میرا رب ہے۔ اور ڈوبنے کے بعد آزر نے نہیں بلکہ ابراہیمؑ نے فرمایا کہ میں ڈوبنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ اذ را ای کوکباً: قال ھٰذا ربی، میں قال کا فاعل آزر ہے نہ کہ ابراہیمؑ۔ پھر اس کے بعد ہی ہے فلما افل قال لا احب الافلین، اس قال کا فاعل ابراہیمؑ ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی طرح آگے چاند اور سورج کے بارے میں باپ بیٹے کا مکالمہ ہے۔ ایک قال کی ضمیر کا مرجع آزر اور دوسرے قال کی ضمیر کا مرجع ابراہیم ہے۔ جب دونوں کے مرجع اوپر موجود ہیں تو ایک ہی کو مرجع بنانے کی کوئی معقول وجہ نہیں۔ اس طرح وہ تمام پیچیدگیاں ختم ہو جاتی ہیں جو غلط ترجمے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں اور مفسّرین کو طرح طرح کی تاویلات پر مجبور کرتی ہیں۔

۲۔ سورۂ واقعہ میں اصحاب الیمین کے اخروی انعامات کے ذکر میں ہے: وفرشٍ مرفوعۃ۔ تمام کے تمام مترجمین نے اس کا ترجمہ یہ کرتے ہیں کہ اونچے اونچے فرش (یا بچھونے) ہوں گے۔ یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ اگر ایک فرلانگ اونچے بچھونے ہوں تو یہ کونسی نعمت ہوگی۔ دراصل فراش (جمع فرش) زوج کو کہتے ہیں۔ اور مرفوع کے معنی ہیں بلند مرتبت، باعزت۔ یہ دونوں معنی ہر معتبر لغت میں موجود ہیں۔ میاں بیوی میں ہر ایک دوسرے کا زوج اور فراش ہے۔ فرش مرفوعۃ (بلند مرتبہ ازواج) کے فوراً ہی بعد ہے: انا انشأنٰھن الخ یعنی ہم نے ان ازواج کی عمدہ اٹھان اٹھائی اور ان کو باکرہ ہم عمر بنایا۔ یہ ھُنَّ کا مرجع وہی فرش مرفوعۃ ہے۔ اگر فُرُش کے معنی بچھونے کے ہوں تو کیا سارے بچھونے باکرہ اور ہم سن ہوں گے؟

۳۔ سورۂ مرسلات میں ہے: واذا الرسل اقتت۔ اس کا تمام مترجمین نے یہ ترجمہ کیا ہے کہ جب رسولوں کا وقت مقرر کیا جائے گا۔ یہاں ہر مفسّر کو یہی مغالطہ ہوا ہے کہ رُسُل جمع ہے رسول کی۔ حالانکہ یہاں رسل کا لفظ واحد ہے۔ رسول کی جمع نہیں۔ رَسل کے معنی ہیں ایسی چھوٹی بچی جو دو پٹہ نہ اوڑھتی ہو۔ سورۂ تکویر میں ہے: واذا الموءودۃ سئلت الخ جب زندہ درگور کی ہوئی بچی سے پوچھا جائے گا کہ اسے کس جرم میں قتل کیا گیا۔ سورۂ مرسلات میں اسی بچی کا ذکر کیا گیا ہے۔ سورۂ تکویر میں صرف مسئولیت کا ذکر ہے اور یہاں سورۂ مرسلات میں اسی جرم قتل کے فیصلے کا وقت بتایا گیا ہے۔ یہاں رُسل کو واحد مؤنث ماننے بغیر کوئی چارہ نہیں کیونکہ اگر یہ رسول کی جمع ہوتی تو عربی قواعدِ مسلّمہ کے مطابق واذا الرسل اقتوا (بہ صیغۂ جمع مذکر) ہونا ضروری تھا۔ قالت النصارٰی تو صحیح ہے لیکن النصارٰی قالت بالکل ہی غلط ہے۔ یہاں النصارٰی قالوا ہی کہنا پڑے گا[1]۔ یہ ایک ایسا عام اور مسلّم قاعدہ

---

[1] ماہنامہ "فیض الاسلام" [illegible] ہے۔ یہاں بہت اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے کہ پورے کلامِ عرب میں کوئی استشناد موجود نہیں ۔ اور تعجب ہے کہ رازی، زمخشری اور بیضاوی جیسے ماہرینِ ادب کی نظر اس طرف نہ گئی۔

غرض ایسے ایسے بے شمار تفسیری نکات انھوں نے بیان فرماتے ہیں اور بعض لکھے بھی ہیں ۔ وہ قرآن کو تو آخری سند مانتے تھے لیکن کتب تفاسیر کو (استفادہ کرنے کے باوجود) آخری سند تسلیم نہیں کرتے تھے ۔

لغوی تحقیق

صرف و نحو اور معانی و بیان کے علاوہ لغوی تحقیق میں بھی ان کو بڑی دستگاہ حاصل تھی ۔ ان کا کہنا ہے کہ تمام کے تمام عربی لغات غیر اسلامی اور عجمی اثرات سے متاثر ہو گئے ہیں۔ اس کی بہت سی مثالوں میں ایک مثال لفظ اُمّی کی ہے جس پر ان کا ایک مستقل رسالہ ہے[۱]

مولاناؒ فرماتے تھے کہ مترجمین قرآن بھی اور اہلِ لغت بھی اُمّی کے معنی "اَن پڑھ" کرتے ہیں ۔ حالانکہ اس کا مطلب ہے اُمّ القریٰ یعنی مکّے شریف سے نسبت رکھنے والا ۔ اور امیین اسی نسبت سے بنی اسماعیل کو کہتے ہیں ۔ مولاناؒ نے اس پر تفصیل سے گفتگو کی ہے اور اس سلسلے میں اس روایت پر خاصی جرح کی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ :

ہم تو اُمّی لوگ ہیں، نہ لکھنا جانیں نہ حساب کتاب الخ

اس روایت کی وجہ سے لوگوں نے اُمّی کے معنی اَن پڑھ سمجھ لیے ہیں حالانکہ یہ روایت ہی محلِ نظر ہے ۔

مطالعۂ تاریخ

جہاں تک کتب تاریخ کا تعلق ہے وہ اس بارے میں خاصی آزاد فکر رکھتے تھے ۔ وہ فرماتے تھے کہ ان کتابوں نے اسلامی تاریخ کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے ۔ محمد بن جریر طبری کے بارے میں انھوں نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ طبری دو ہیں ۔ دونوں کی کنیت ابو جعفر، دونوں کے نام محمد، دونوں کے باپوں کا نام جریر، دونوں کا وطن آمل طبرستان، دونوں کا سنِ وفات ۳۱۰ھ، دونوں کی وفات بغداد میں ہوئی ۔ ان میں ایک سنّی ہے اور دوسرا شیعی ۔ سنِ ولادت کا ایک دو سال کا فرق ہے ۔ ایک کے دادا

---

[۱] اس کے ضروری حصے [illegible]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا نام رستم اور ایک کے دادا کا نام یزید ہے ۔ دونوں صاحب تصنیف ہیں ۔ لیکن ایک کی بعض تصنیف دوسرے کی طرف منسوب ہوگئی ہے ۔ مؤرخ طبری شیعی ہے اور ایک طبری پر کیا موقوف ہے ۔ الاخبار الطوال کا مؤلف ابوحنیفہ دینوری شیعی ہے مقتل حسین کا مصنف ابومخنف شیعی ہے ۔ اور طبری حدثنا کہہ کر پوری سند سے بیان کرتا ہے لیکن اس کے مغالطوں کا یہ حال ہے کہ بہت سی روایتیں حدثنا السّریؒ کہہ کر بیان کرتا ہے ۔ (یعنی ہم سے "سری" نے بیان کیا) اور لطف کی بات یہ ہے کہ صحیح تاریخ کے مطابق سریؒ کی وفات کے دو سال بعد (اور دوسری روایت کی رُو سے ۲ سال پہلے) طبری صاحب اس دنیا میں تشریف لاتے تھے ۔ لہٰذا حدثنا السّریؒ کہنا دروغ کی نادر مثال ہے ۔

مولاناؒ نے اس طرح کی بے شمار اسناد روایات پر جرح کر کے ان کے سقم کو واشگاف کیا ہے ۔

اور اس پر مختلف اردو اور عربی رسالے لکھے ہیں اور مضامین تو بے شمار سپرد قلم کیے ہیں جو اکثر شائع بھی ہو چکے ہیں ۔

فقہی اجتہاد

فقہ میں بھی علامۂ موصوفؒ کو گویا مقام اجتہاد حاصل تھا اور وہ حنفی مسلک کو زیادہ پسند کرتے تھے ۔ لیکن نہ تو حنفی فرقے کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرتے تھے اور نہ حنفی مسلک کی ہر بات کو بے چون و چرا مان لینے کے قائل تھے ۔ انھیں جہاں فقہ کا کوئی مسئلہ کتاب و سنت کی روح کے خلاف نظر آتا اسے ترک کرنے میں کوئی تامل نہ ہوتا تھا ۔

ان کی ایک کتاب "الطلاق مرتٰن" شائع ہو چکی ہے جس میں انھوں نے تفصیل کے ساتھ بحث کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ تین طلاقوں کو قرآن نے بالکل ختم کر دیا ہے اور صرف دو طلاقوں کو روا رکھا ہے تاکہ اس کے بعد یا تو عدت کے اندر رجوع کا موقع باقی رہے یا عدت ختم ہونے کے بعد خود بخود بائن ہو جائے اور تجدید نکاح کا موقع باقی رہے ۔ جب تین طلاقوں کو قرآن نے تسلیم نہیں کیا تو یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ تین طلاقوں کے بعد وہ مغلظہ ہو جاتی ہے جس کے بعد حلالے کے بغیر وہ اپنے شوہر اول سے نکاح نہیں کر سکتی ۔ حلالہ صرف مختلعہ (خلع لینے والی عورت) کے لیے ہے جس کا ذکر اسی آیت (الطلاق مرتٰن) میں ہے ۔ اور خلع کا مطلب بھی طلاق لینے کی شرط پر نکاح کرنا نہیں بلکہ اس کا مقصد محض عقد ثانی ہے جس کے بعد اگر شوہر ثانی طلاق دے دے تو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عورت اپنے شوہر اوّل سے نکاح کر سکتی ہے۔

اسی طرح قانون وراثت پر مولانا کا ایک مستقل قلمی رسالہ ہے جس میں انھوں نے فقہا کی کئی غلطیوں کی نشاندہی فرمائی ہے۔ وہ عول کے قائل تھے۔ اور ایک مفصل مضمون بھی اس پر شائع ہو چکا ہے جس کا عنوان ہے "عول کا ھول"۔ لیکن خود مجھ سے فرمایا تھا کہ: مجھے اس پر اطمینان نہیں۔ قانون وراثت کے سلسلے میں بڑی گہری نظر خواجہ احمد دین امرتسریؒ کی ہے یا انہی کی پیروی میں مولانا اسلم جیراجپوری کی۔ لیکن بعض پیچیدگیوں کو حل کرنے میں علامہ تمناؔ منفرد ہیں۔ آیاتِ وراثت میں دو جگہ "کلالہ" کا ذکر ہے اور دونوں جگہ بھائی بہن کے حصے مختلف بیان کیے گئے ہیں اور سارے مفسرین نے عجیب و غریب قیاسات سے کام لیا ہے۔ مولاناؒ نے پہلے تو کلالہ کا صحیح مطلب بتایا ہے کہ از روئے قرآن کلالہ ہر اس شخص کو کہتے ہیں جس کی کوئی اولاد نہ ہو اور بھائی یا بہن موجود ہو۔ والدین کی غیر موجودگی کلالہ ہونے کی کوئی شرط نہیں۔ اس کے بعد بتایا ہے کہ کلالہ کا ماں یا باپ موجود ہو تو بھائی بہن میں ہر ایک کو پہلے ملے گا اور اگر باپ یا ماں موجود نہ ہو تو بھائی کو کل ترکہ ملے گا اور بہن کو آدھا۔ دونوں ہوں تو بھائی کو بہن کا دگنا۔ یہ جمع و توفیق کی وہ راہ ہے جو مولاناؒ سے پہلے کسی نے بھی نہیں پیدا کی تھی۔

غرض اس قسم کے بہت سے فقہی مسائل ہیں جن میں مولاناؒ کی فکر آزاد نے اجتہادی رنگ اختیار کیا ہے اور ان کی فطرت نے کورانہ تقلید سے انکار کر دیا ہے۔

مولانا نسوار کے بڑے عادی تھے۔ روزے میں بھی نسوار لیا کرتے تھے۔ ڈھاکے میں ان کو روزے میں نسوار لیتے ہوئے دیکھ کر ایک مولوی صاحب بھڑک اٹھے اور کہنے لگے کہ اس سے روزہ مکروہ ہو جاتا ہے بلکہ فاسد ہو جانے کا قوی امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ علامہ تمناؒ نے ان کا غصہ دیکھ کر بڑی سنجیدگی سے فرمایا:

"مجھے یقین ہے کہ آپ پکے نمازی ہیں اور وضو کیے بغیر نماز ادا نہ کرتے ہوں گے۔ پھر یہ فرمائیے کہ روزہ رکھنے کے باوجود آپ وضو کرتے ہوئے ناک میں پانی کیوں لیتے ہیں؟ اس پر وہ مولوی صاحب ایسے خاموش ہوئے کہ کوئی غلط بحث بھی نہ کی۔"

مولانا روزے میں سگریٹ لینے کو بھی بالکل جائز سمجھتے تھے اور وہ پنجگانہ نماز کے علاوہ تہجد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے بھی بڑے پابند تھے اور روزوں کا تو یہ حال تھا کہ شش عید کے روزے بھی رکھ لیتے تھے مگر اس کے پابند نہ تھے۔ گزشتہ رمضان ۹۲ھ ان کا آخری رمضان تھا۔ وہ بے حد کمزور ہو گئے تھے۔ کھڑے ہو کر چلنا بھی ان کے لیے گویا ناممکن ہو گیا تھا۔ پھر بھی ابتدائی چار روزے رکھے۔ ان کی آرزو تھی کہ رمضان میں بحالتِ صوم موت واقع ہو لیکن تمنا کی یہ تمنا پوری نہ ہو سکی کیونکہ اواخرِ شوال میں ان کی موت مقدر تھی۔

اندازِ تحریر

علامہ تمنا کی اردو نثر پرانے انداز کی تھی اور علمی مضامین میں خاصا اغلاق بھی ہوتا تھا بعض اوقات بڑے لمبے لمبے جملے ہوتے تھے۔ اصطلاحات کو وہ اس بے تکلفی کے ساتھ لکھتے تھے جیسے ان کے خیال میں ہر قاری انہی کی طرح پڑھا لکھا ہے اور ہر بات کو وہ آسانی سے سمجھ لیتا ہے۔ مَیں نے ایک بار انھیں لکھا کہ اگر آپ اپنے طرزِ تحریر میں کچھ فصاحت و سلاست پیدا فرمائیں تو عوام کے لیے اس کی افادی حیثیت بہت بڑھ جائے گی۔ انھوں نے جواب میں لکھا کہ جس اندازِ تحریر کا مَیں عادی ہو چکا ہوں اس کو بڑھاپے میں بدلنا بہت مشکل ہے۔

اپنے معتقدات میں اتنے پختہ اور متصلب تھے کہ جس کے خلاف لکھنے پر اتر آتے اس کے لیے سخت سست الفاظ استعمال کرنے میں بہت کم تامل ہوتا تھا۔ مَیں نے اس اندازِ تخاطب سے جب اختلاف کیا تو کچھ عرصے تک تو اس سے اجتناب کیا مگر احتیاط کے باوجود یہ پختہ عادت بار بار عود کرتی رہی۔

ان کی تحریر میں مولانا رومیؒ جیسا انداز بھی تھا۔ یعنی ایک موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے درمیان میں ضمناً کوئی مضمون آ گیا تو اس پر بھی وہیں تفصیلی گفتگو شروع ہو گئی۔ بہت آگے جا کر پھر اصل موضوع کی کڑی ملتی تھی۔ مَیں نے ان سے مؤدبانہ عرض کیا کہ ضمنی موضوعات کو آپ اس طرح تفصیل سے نہ لکھا کیجیے کہ پڑھنے والا یہ سمجھے کہ شاید اصل موضوع یہی ہے۔ فرمانے لگے کہ مضمون کے درمیان جو شکوک پیدا ہو سکتے ہوں ان کو الگ مضمون کی شکل دینے کے بجائے مَیں وہیں لکھ کر ہر پہلو سے صاف کر دینا چاہتا ہوں اور یہ اس خیال سے کرتا ہوں کہ خدا جانے پھر اس کا موقع ملے یا نہ ملے۔ یہ بھی ایک عادت سی ہو گئی ہے اور [illegible] اندازِ نگارش میں ڈھل جانا اب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میرے لیے بہت دشوار ہے ۔ یوں سمجھو کہ میں صرف مختلف مواد اکٹھا کر دیتا ہوں ۔ اسے جدید قالب میں ڈھالنا تم لوگوں کا کام ہے ۔

مرحوم میرے بہت سے مشوروں کو مان لیتے تھے لیکن بعض گزارشوں کو نہ ماننے پر آج تک تعجب ہے ۔ وہ "املے" کے بڑے پابند تھے لیکن ایک جگہ "توبے سے" لکھ گئے ۔ میں نے عرض کیا لفظ "توبہ" میں امالہ نہیں ہوسکتا ۔ میں نے قواعد پیش کیے ۔ اصول امالہ بتائے ۔ ہزار سمجھانے کی کوشش کی لیکن مولاناؒ نے اس وقت تسلیم نہ کیا ۔ ممکن ہے بعد میں "توبے" سے توبہ کرلی ہو ۔

ایک بار انھوں نے کسی شعر میں "سونچ" لکھا ۔ میں نے کہا کہ میں بھی "سوچ" کو بہت سی تحریروں میں "سونچ" لکھتا رہا ہوں ۔ مگر اب میں "سوچ" ہی کو صحیح سمجھتا ہوں ۔ فرمانے لگے کہ املے کے قاعدے کے متعلق تو تم یہ کہتے ہو کہ جس طرح بولا جائے اسی طرح لکھنا بھی چاہیے ۔ پھر "سونچ" کو (جو نون غنہ کے ساتھ بولا جاتا ہے) سوچ لکھنے پر کیوں اصرار ہے؟ میں نے کہا کہ املے کا قاعدہ ہر جگہ چسپاں کرنا ضروری نہیں ۔ چاول (نون غنہ کے ساتھ) بولتے ہیں لیکن "چانول" نہیں لکھا جاتا ۔ یہی "آم" کا حال ہے ۔ اس کے بولنے میں بھی نون غنہ کی ملاوٹ ہوتی ہے ۔ مگر "آنم" لکھا نہیں جاتا ۔ ایسے بہت سے الفاظ اور بھی ہیں ۔ میری اس گزارش کو انھوں نے ذرا سوچنے کے بعد مان لیا ۔

میرے بعض مشوروں کو ماننے میں انھیں تامل ہوتا تو کہتے کہ تم کوئی سند نہیں ہو ۔ اندر جاکر اپنی "حویلی" سے پوچھو ۔ وہ لکھنؤ کی اہلِ زبان ہیں ۔ (صوبۂ بہار کے پرانے لوگ بیگم کو "حویلی" کہا کرتے ہیں اور مولانا مرحوم کی زبان پر بھی یہی لفظ چڑھا ہوا تھا) ۔

علامہؒ مرحوم کے مضامین بے شمار ہیں ۔ جتنی کتابیں اور مضامین شائع ہو چکے ہیں ان سے زیادہ مسوّدوں کی شکل میں موجود ہیں ۔ کچھ مسودات میرے پاس بھی ہیں ۔ یہاں ان کی فہرست پیش کرنے کی گنجائش نہیں ۔ جو مسودات مشرقی پاکستان میں رہ گئے یا ضائع ہوئے وہ بھی بہت تھے ۔ ان کا صحیح اندازہ بتانا میرے لیے مشکل ہے ۔

وصیّت نامہ : انھوں نے اپنی وفات سے کوئی ڈیڑھ سال پہلے ایک منظوم وصیت نامہ لکھا تھا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو کراچی میں محفوظ ہے۔ اس میں انھوں نے سُوم، چہلم، عرس، فاتحہ، ایصالِ ثواب، قبر کو پختہ بنانے، چادر یا پھول چڑھانے کی شدت سے ممانعت کی ہے۔ ان پر توحید کا بڑا غلبہ تھا۔ ان کی مفصل سوانح عمری کے لیے ضخیم تالیف کی ضرورت ہے۔ اس وقت تو ہم نے محض سرسری سا خاکہ لکھا ہے۔ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

مولانا عرشی امرتسری نے ان کی تاریخِ وفات یہ لکھی:

در خلد رفتہ از دارِ فانی — عامل تمنا، کامل تمنا

سالِ وفاتش تحقیق کردم — فرمود ہاتف "فاضل تمنا"

۱۳۹۲ھ

یادگارِ شبلی: از ڈاکٹر شیخ محمد اکرام

شمس العلما علامہ شبلی نعمانی کو ہمارے ادب اور علمی و فکری تاریخ میں جو بلند مقام حاصل ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ ان کے احوالِ زندگی سید سلیمان ندوی مرحوم نے ۱۹۴۳ء میں حیاتِ شبلی میں جمع کیے تھے۔ تصانیف کے بارے میں وہ ایک علیحدہ کتاب لکھنا چاہتے تھے لیکن یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر محمد اکرام کی اس کتاب "یادگارِ شبلی" میں نہ صرف مکمل حالاتِ زندگی ہیں اور اس ضمن میں وہ مواد سمیٹ لیا گیا ہے جو حیاتِ شبلی کی اشاعت کے بعد شائع ہوا یا سید صاحب کو کسی وجہ سے دستیاب نہ ہو سکا، بلکہ علامہ شبلی کی ہر اہم کتاب پر علیحدہ تفصیلی تبصرہ شامل ہے۔

علامہ شبلی ایک جامع حیثیات ہستی تھے۔ وہ بیک وقت اعلیٰ درجہ کے مصنف، معلم، مورخ، شاعر اور سیاست دان تھے۔ انھوں نے سولہ برس علی گڑھ کالج میں سرسید کے دستِ راست کی حیثیت سے گزارے اور علی گڑھ تحریک کے رکنِ رکین رہے لیکن وہ ندوۃ العلما کے بھی "جزوِ غالب" تھے اور علما کی تنظیم اور قدیم کی پاسداری کے لیے عمر بھر سرگرم عمل رہے۔

یادگارِ شبلی اس جامع حیثیات ہستی کی زندگی، کارناموں اور تصانیف کے طویل اور غائر مطالعہ کا ماحصل ہے۔ انشاء اللہ اس سے نہ صرف شبلی شناسی کی نئی راہیں کھلیں گی بلکہ قوم کے فکری مسائل سمجھنے اور ان کا مناسب حل تلاش کرنے میں بھی مدد ملے گی۔

ضخامت: ۴۶۸ صفحات — قیمت: ۱۴ روپے

ملنے کا پتہ: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

© rasailojaraid.com